خطبۂ صدارت یومِ رسوا

از

(جناب ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی دہلی یونیورسٹی دہلی)

(جو ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے صدر کی حیثیت سے جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کی انجمن ترقی پسند مصنفین کے اس خصوصی جلسہ میں پڑھا جو ۸ مارچ ۱۹۵۸ء کو مرزا ہادی رسوا لکھنوی کی یاد میں منعقد کیا گیا تھا۔)

خواتین و حضرات!

میں جامعہ کی انجمن ترقی پسند مصنفین کے محترم کارکنوں کی خدمت میں رسوا کی یاد منانے پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ نیز آپ کی اس محبت کا بھی شکر گزار ہوں جو آپ نے اس کی صدارت میرے سپرد کر کے فرمائی ہے۔

میں اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے یومِ رسوا کے لئے کوئی مقالہ نہیں لکھ سکا تھا میرے عزیز دوست ڈاکٹر سلامت اللہ صاحب کا برابر اصرار رہا اور وہ بڑھتا ہی رہا بالآخر انھوں نے کہا کہ اگر آپ نے مقالہ نہیں لکھا تو آپ کو اس جلسہ کی صدارت کرنا پڑے گی۔

میں اس وقت اسی جرم کی پاداش میں آپ کے سامنے حاضر ہوں!

میں دیکھتا ہوں کہ انھوں نے میری "رسوائی" کا پورا سامان بہم پہنچایا ہے۔ ایک ایسی محفل میں جہاں ایسے لوگ موجود ہوں جنہوں نے خاص طور پر مرزا رسوا کا مطالعہ کیا ہے مجھ جیسے کم مایہ کالب کشائی کرنا رسوائی سے کم نہیں۔ واقعی ایسا محسوس کر رہا ہوں جیسے مجرم ہوں لیکن اس دعوت میں ان کی کتنی محبت پوشیدہ ہے، خلوص کا کتنا بڑا جذبہ شامل ہے اس کو میرا دل جانتا ہے۔

حضرات! آپ کی انجمن کی یہ ادا مجھے بہت پسند آئی کہ وہ ہر سال اردو کے ایسے مشاہیر کی یاد تازہ کرتی ہے جن کا ادب میں ایک بڑا مقام تو ہے یا ہونا چاہئے لیکن ان کے متعلق عام معلومات زیادہ نہیں۔ اس سے پہلے یہ انجمن یوم نظیر، یوم سرشار، یوم مومن منا چکی ہے اور وہ جلسے بہت کامیاب ہو چکے ہیں۔

آپ نے یہ دن منا کر بہت اہم اور ضروری قدم اٹھایا ہے۔ آج اگر کسی چیز کی ضرورت ہے تو ان ہی سینہ کے داغوں سے "بہار" پیدا کرنے کی — یہ بات میں نے پہلے کہی ہے لیکن اس کے اعادے کی ضرورت ہے کہ اردو صرف کتابوں میں لکھے رہنے سے زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس کی زندگی کی صرف ایک صورت ہے کہ اس کی تاریخ ہر اردو داں کے دل اور دماغ کے ریشے ریشے میں زندہ ہو اور اس کی ادبی شخصیتوں کے کارنامے لوحِ دل پر کھدے ہوئے ہوں۔ وہ خود اس ورثے سے بہرہ یاب ہو اور اس کی نیکیاں اور اچھائیاں اپنی آئندہ نسلوں کو منتقل کر دے۔

یوم سرشار اور یوم رسوا کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ آج نئی آب و ہوا نے ہمارے سامنے عجیب و غریب تہذیبی مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ ہم ہر چیز کو بازار کی ترازو میں تولتے ہیں اور جدھر پلہ جھکتا ہے خود بھی ادھر جھک جاتے ہیں۔ ہم اردو سے اس لئے بے تعلق ہوتے جاتے ہیں کہ اس سے ہمیں روٹی نہیں ملتی۔ نوکری کے حصول میں آسانی نہیں ہوتی۔ یہ "نقد سودے کا اصول" بے حد خطرناک ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے سامنے زندگی کے وہ اعلیٰ مقاصد نہیں جو اسے بامقاصد اور بامعنی بنا دیتے ہیں اور جس طرح میں نے ایک دفعہ ایک جلسہ میں کہا تھا۔ ہم زبان و ادب کی تنویری قوت سے بے خبر ہیں اور کل زندگی میں اس کا جو مقام ہے اس کے شناسا نہیں۔ بے روزگاری کی بات اہم اور بہت اہم ہے لیکن یہ بات دراصل اتنی آسان بھی نہیں جتنی ہم نے سمجھ رکھی ہے۔ یہ مسئلہ کسی مضمون کے پڑھنے یا نہ پڑھنے سے طے نہیں ہو سکتا۔ یہ اس سے کہیں بڑا معاملہ ہے۔ اس کا انحصار ایک یا دو پلانوں پر بھی نہیں، یہ سارے ملک کی معاشی تنظیم کا مسئلہ ہے۔ پیداوار اور دولت کی مناسب تنظیم اور بہتر تقسیم کا مسئلہ ہے۔ جو لوگ اردو سے اس قسم کا مطالبہ کرتے ہیں ان کو دیکھ کر مجھے انگریزی زبان و ادب کے ایک استاد یاد آجاتے ہیں جنھوں نے اپنی ہندوستانی بیوی کو محض اس جرم میں طلاق دے دی تھی کہ وہ ملٹن نہیں سمجھتی تھی!

اس موقع پر ایک بات اور عرض کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ ہمارا ادب ابھی تک خواص کی ملکیت رہا ہے۔ وہ ایک خاص دائرہ سے باہر نہیں نکلا۔ اس کا ذوق بھی ایک خاص احاطہ میں محدود ہے۔ ملک میں جو جمہوری نظام قائم ہوا ہے اور سلطانی جمہور کی جو اساس رکھی گئی ہے، اس کا تقاضہ یہ ہے

کہ ہم ان نیکیوں کو جو ہمارے اچھے ادب سے متعلق ہیں عام کردیں۔ اس خیر و برکت کو جو صالح لٹریچر میں چھپی ہوئی ہے سب تک پہنچا دیں، ایک مرتبہ آپ نے یہ کام صحیح اصول کے ساتھ دہلی میں کیا تھا اور "آگرہ بازار" اسٹیج کر کے فکر و نظر کی عام دعوت دی تھی۔ اس کے نغمے مہینوں تک فضا میں گونجتے رہے۔ یاد ہے آپ کو؟ یقین کیجئے کہ لوگ اس روحانی غذا کے لئے بے چین ہیں اور اس کی ضرورت نئے ہندوستان کی ترقی کے ساتھ روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ غزل کی شاعری کل شناس اور ہمہ داں ہوتی ہے اور چوں کہ انسان میں خدا کی سی کلیت ہے اس لئے غزل کے ذریعہ کائنات کی ہم آہنگی کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ کتنا بڑا دعویٰ ہے یہ! لیکن ہم نے اس کے ثابت کرنے کے لئے کیا کیا ہے؟ میرؔ، سوداؔ، غالبؔ، حالیؔ، میر انیسؔ اور رسواؔ پر ہم جان دیتے ہیں لیکن ابھی تک ہم نے ادب کے اس آئینہ خانہ میں جو زندگی کے جلوے یا اعلیٰ قدریں ہیں ان کو عام نہیں کیا۔ پھیلایا نہیں۔ شکسپیر آج بچوں کا بھی ہے، بوڑھوں کا بھی، کارخانہ کے مزدوروں کا بھی اور اہلِ علم کا بھی۔ انگلستان کا بھی، جرمنی اور روس کا بھی۔ ہمیں بھی اپنی بلند پایہ شخصیتوں کو اور ان کی تخلیقات کو ہر طبقہ تک مختلف فنی طریقوں سے پہنچانا چاہیے اور اس فرض کو پورے خلوص اور محنت سے انجام دینا چاہیے۔

خواتین و حضرات! میں یہ عرض کر رہا تھا کہ آپ نے یہ جلسہ منعقد کر کے کام کی ایک صحیح سمت متعین کی ہے لیکن یہ کام بڑی ریاضت چاہتا ہے رسوا کی زندگی کے کتنے گوشے ہیں جو تاریکی میں ہیں۔ ان کے بعض ناول، ان کے پس منظر، ان کی شاعری، سب بڑی حد تک پردۂ خفا میں ہیں رشید نعمانی صاحب نے حیات اور سیرت کے بعض گوشوں پر نہایت خوبی سے روشنی ڈالی ہے لیکن کام کی اہمیت کا تقاضا یہ ہے کہ اسے وسیع پیمانے پر کیا جائے۔ ہم نے تنقید پر زیادہ زور دیا ہے۔ اس کا تحقیق سے بہت گہرا تعلق ہے۔ ہمیں اس تعلق کو بھی برقرار رکھنا چاہیے۔

ہمارا تمام قدیم ادب ادبیاتِ عالیہ میں ممتاز مقام کا مستحق نہیں ہے۔ اس میں مغز کم اور پیاز کے چھلکے زیادہ ہیں لیکن پھر بھی اس کے ایک حصہ میں انسانیت کی جذباتی قدریں پوشیدہ ہیں اس کے علاوہ بھی اس میں بہت کچھ موجود ہے جس کی جھلک اگر ہمیں موجودہ اردو

لٹریچر میں نظر آجائے تو وہ غالب کا تیر نیم کش بن سکتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ کے سامنے یہ جذبہ ہے آپ ماضی کی صحیح قدر و قیمت متعین کرنا چاہتے ہیں اور اس کے اچھے عناصر کو نئی زندگی کے سوز و ساز میں شریک کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے اس کی بھی خوشی ہے کہ آپ نے اس کام کے لئے رسوا کا انتخاب کیا جو اردو کے ناول نگاروں میں ایک بڑی دل نواز اور متوازن شخصیت ہے۔

ان کا یہ توازن بعض اوقات عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ بالکل دو اور دو چار کا کم سے کم "شریف زادہ" میں تو یہی ہے۔ مرزا عابد حسین کا کردار ایک سیدھی لکیر ہے۔ اس میں کوئی دائرہ کوئی زیر و بم، کوئی پیچ و خم نہیں۔ اس لئے اس میں زندگی کم اور بہت کم ہے لیکن امراؤ جان ادا ان ہی کے نہیں، اردو ادب کے بے مثل ناولوں میں سے ہے۔ اس میں بڑی زندگی ہے، اگرچہ خود امراؤ جان ادا باوجود نہایت اہم ہونے کے ایک معنی میں ذیلی حیثیت رکھتی ہے لیکن وہ اور اس کے ساتھ کردار خورشید، بسم اللہ خانم، بوا حسینی راشد، فیضو، سلطان، مولوی صاحب وغیرہ سب ہی ایک مٹتی ہوئی تہذیب کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ اور ہمیں ایک خاص سماج کے مختلف طبقوں سے واقف کراتے ہیں۔ ان سب کا حاصلِ ضرب امراؤ جان ایک طوائف نہیں بلکہ ان کا حاصلِ ضرب لکھنؤ کی مٹی ہوئی تہذیب ہے جس میں شعر و شراب و شباب کی رنگینیاں اور رقص و سرود کی محفلیں ایک خاص مقام رکھتی ہیں لیکن رسوا کا یہ کمال ہے کہ انھوں نے اس تہذیب پر بڑی غیر جانب دارانہ نظر ڈالی ہے۔ اس کی خوبیوں اور خامیوں دونوں کو دکھلایا ہے۔ جہاں معاملہ محبت یا جذباتی لگاؤ کا ہو وہاں یہ بالغ نظری مشکل ہے۔ لیکن رسوا نے امراؤ جان ادا میں تبلایا ہے کہ یہ دور محض رات اور زلف کی کہانی نہیں ہے۔ اجتماعی انحطاط اور سیاسی زوال کے متعلق جو کچھ بھی کہا جائے لیکن ابھی انفرادی زوال مکمل نہیں ہوا تھا۔ وقت کی ان عام مایوسیوں میں عزت اور وضع داری کی حیرت انگیز مثالیں مل جاتی ہیں۔ مرزا سلطان اس کا بہت عمدہ نمونہ ہیں۔

مرزا رسوا نے ایک مخصوص انداز میں خارجی حقیقتوں کو سمو لیا ہے اور اودھ کے ذہن اور زمانہ کو اس طرح ناول کے پیرایہ میں پیش کیا ہے کہ اس کی دوسری نظیر ہمارے ادب میں نہیں۔

یونسکو نے بجا طور پر اس کو ترجمہ کے لئے انتخاب کیا ہے۔

امراؤ جان ادا میں سماجی اور اقتصادی تضاد اور فرد اور معاشرہ کے عدم توازن کے متعلق ایسے بلیغ اشارے اور معاشرتی زندگی کے متعلق اتنا کارآمد اور اہم مواد ملتا ہے جو اس عہد کی تاریخوں میں نہیں اور اس لئے ہمارے تخیلی کلچر میں اس ناول کی ایک مستقل جگہ ہے اس اعتبار سے میں رسوا کو محض ناول نگار نہیں ایک قسم کا مورخ بھی سمجھتا ہوں۔ میں مقابلہ نہیں کرتا بلا تشبیہ کہتا ہوں کہ رابن سن کروسو کو اس سے قبل یہ شرف حاصل ہو چکا ہے۔ اٹھارویں صدی میں پولٹیکل اکانومی کے لکچروں میں اس قصہ کے حوالے دئے گئے اور اسٹوارٹ مل کی تصانیف میں اس کی گونج سنائی دی اور اس طرح ڈکس اور تھیکرے کے ناول بھی اس عہد کے متعلق وہ مواد بہم پہنچاتے ہیں جن سے رسمی تاریخوں کا دامن خالی ہے۔

امراؤ جان ادا کے متعلق آپ نے رشید لنمانی صاحب کا مقالہ سنا جو رسوا کے عہد اور ان کی زندگی کے متعلق ایک فریم ورک کی حیثیت رکھتا ہے اور اس اعتبار سے بہت مفید ہے۔ بیگم رضیہ سجاد ظہیر نے امراؤ جان ادا کو اپنی مسیحا نفسی سے زندہ کر دیا ہے ع

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیان اپنا!

تخئیل اور زبان کا یہ اعجاز معمولی نہیں کہ ماضی اور حال کا فرق مٹ جائے اور بالکل یہ معلوم ہو کہ امراؤ جان ادا ایک دفعہ پھر اس خاک دان ارضی میں آگئی ہے اور ہم اس کے روبرو ہیں۔ بیگم انیس قدوائی کا مقالہ بھی بصیرت و مسرت کے بہت سے پہلو اپنے اندر رکھتا ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے لئے ایک نئی راہ نکال لیتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جس طرح ان تقریروں سے میں مستفید اور محظوظ ہوا ایسے ہی آپ بھی ہوئے۔ میں ان سب کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اپنے خیالات سے استفادہ کا موقع دیا اور اس بزم میں شریک ہو کر اسے کامیاب اور بارونق بنایا۔

آخر میں میں آپ کی تشریف آوری کا، انجمن کا، اس کے انتظامات کا اور اس قدر افزائی کا جو اس نے مجھے مسند صدارت دے کر فرمائی شکریہ ادا کرتا ہوں۔